Journal of Religion & Society (JR&S)
Available Online:
https://islamicreligious.com/index.php/Journal/index
Print ISSN: 3006-1296 Online ISSN: *3006-130X*
Platform & Workflow by: Open Journal Systems

THE CRITICAL & COMPARATIVE ANALYSIS OF DEMOCRACY & ISLAMIC DEMOCRACY

سیکولر جمہوریت اور اسلامی جمہوریت کا تقابلی و تنقیدی جائزہ

Dr-Zia Ur Rehman
Lecturer in Islamic Studies, Kohat University of Science & Technology.
Rashad Manzoor
MS-Scholar, Riphah University, Islamabad.
Pir Muhammad
Ph.D. Scholar, Karachi University.

ABSTRACT
This research article actually contains a different historical method review about the democratic system and its importance on various aspects. And discussed out, does this system and theory capable to be practiced in different countries and cultures? And especially the article is placed in the context that how much space there is, in the Islamic concept of ruling system to accept the democratic system with its original characteristics or it can be adjusted with some modifications in Islamic society? And also here, a summary of the beginning and evolution era of democracy has been presented. Moreover, some renowned names are also introduced as a founders and promotors of the democratic concept. Also discussed that their efforts, and meanwhile the democratic theory suffered from various contradictions. There is enough discussion on the non-religious element in the democratic theory. Although, this research will facilitate the reader in comparative assessment. And also, it tells the point of view of many renowned Islamic scholars who categorically discussed the democratic theory and its significance, merits and demerits.
Keywords: *Representative Democracy, Sharia, Liberal, Nazreya, Political.*

تعارف

جمہوریت عوامی نسبت سے قائم ریاستی اختیار کو منتخب نمائندوں کیطرف منتقل کرنے کا نام ہے۔یعنی ایسا اقتدار جو عوامی انتخاب کیذریعے کیا جائے۔جمہوریت سے متعلق کچھ وضاحتیں اس سے ایک گونا مختلف ہیں، لیکن انمیں سب کا عمومی مقصد و مطلب یہی نکلتا ہے کہ عوامی حقوق کے تحفظ کی نگرانی جب ریاست کیذریعے کی جائے تو وہ جمہوریت کہلاتی ہے۔جمہوریت کے ان فوائد کے باعث پچھلے دو سو سال میں دنیا کے اکثریتی ممالک جمہوری سسٹم کی طرف منتقل ہو گئے۔

آغاز وارتقاء

جمہوریت کا آغاز قدیم زمانے میں یونانی دور سے ہوا ہے، جمہوریت کی ابتداء کی متعین تاریخ کے بارے میں پورے وثوق سے کچھ کہنا شاید مشکل ہو گا، لیکن رزمیہ دور کے بعد سے جمہوریت کی ابتداء ہو جاتی ہے. جمہوریت کی ابتداء یونان سے ہونے سے متعلق برٹانیکا میں لکھا ہے:

Democracy had its beginnings in certain of the city-states of ancient Greece in which the whole citizen body formed the legislature[i],

جمہوریت کا تصور "روم "میں بھی موجود رہا، اور روم میں جمہوریت کا آغاز 509 ق-م میں ہوتا ہے، جس کو محدود جمہوریت کہتے ہیں کیونکہ اس میں ابتداء عوام کے پاس محدود اختیارات تھے پھر رفتہ رفتہ عوام نے اشرافیہ سے اپنے اختیارات لینے شروع کر دیے تھے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ یونان میں رزمیہ دور کے اختتام 800 ق-م کے بعد جمہوریت کا تصور شروع ہو جاتا ہے۔

سید عین الحق صاحب اپنی کتاب "تہذیبیں" میں یونان میں بادشاہت کے بعد سیاسی ارتقاء اور جمہوریت کے آغاز سے متعلق لکھتے ہیں:

عہد شجاعت کے بعد یونانی تاریخ کا ایک دوسرا دور شروع ہوتا ہے، جو سیاسی ارتقاء کا دور ہے۔ اس عہد میں مقامی سرداروں نے صحیح معنوں میں شہری ریاستوں کی شکل اختیار کی اور اہلِ یونان نے مختلف طرز کی حکومتوں کے تجربے کئے، یہاں تک کہ انہوں نے جمہوری انداز کی حکومت بھی قائم کی اور جمہوریت کا ایک واضح تصور دنیا کو عطا کیا۔[ii]

البتہ کم از کم چھٹی صدی قبل مسیح سے یونان میں واضح جمہوریت کا تصور رہا ہے کیونکہ یہ سقراط کا زمانہ ہے، اور سقراط کی طرف سیاسیات کے علم کو منسوب کیا جاتا ہے۔، اور بھی یونان کے مشہور فلاسفہ نے سیاسیات کے موضوع پر کتابیں لکھی ہیں، سقراط نے سیاست کے عنوان پر کام تو کیا، لیکن اس کی کوئی تصنیف منظرِ عام پر نہیں ہے۔ البتہ اس کے تابعدار شاگرد افلاطون نے جو 430 یا 428ق-م کا فلسفی ہے، اس نے اس موضوع پر پہلی کتاب تحریر کی جو انگریزی میں (Republic) کے نام سے اور اردو زبان میں "جمہوریہ" کے عنوان سے چھپ چکی ہے، افلاطون کی یہ کتاب باقاعدہ اس کی تصنیف نہیں ہے۔ بلکہ مقالات کی شکل میں ہے، افلاطون کی یہ کتاب دس مقالات پر مشتمل ہے "جمہوریہ افلاطون" کی تمہید میں مصنف ان مقالات کو لکھنے کی وجہ بیان کرتے ہیں:

"افلاطون سے اس کے زمانہ حیات میں یہ درخواست کی گئی تھی کہ وہ اپنی سیاسیات کی معلومات کو ایک ریاست کی فرمانروائی میں صرف کرے"[iii]

اس کی طرف منسوب ان مقالات کے بارے میں محققین سوانح نویس اختلاف کرتے ہیں کہ آیا یہ اسی کے مقالات ہیں یا اس کے کسی شاگرد نے ان کو افلاطون کی طرف منسوب کیا ہے، البتہ اس شخص نے پہلی کتاب سیاست کے عنوان پر لکھی۔

پھر اس کے بعد "ارسطو" نے بھی علم سیاست پر قلم اٹھایا، ارسطو کو سائنس کے بھی تمام شعبوں کا بانی سمجھا جاتا ہے، علم طب، علم حیوانات، علم طبقات الارض، علم فلکیات، علم البصریات، ان تمام موضوعات کی خشتِ اول ارسطو نے رکھی ہے، اور علم سیاست پر بھی اس نے ایک کتاب لکھی ہے جو "سیاست" ہی کے عنوان سے معنون ہے۔، جس کو انگریزی زبان میں (Politics) کے نام سے شائع کیا گیا ہے، ارسطو، افلاطون کا شاگرد تھا اس لیے اس نے اس کی کتاب "جمہوریہ" کو جو غیر مدون شکل میں تھی، اسی کو مدون بھی کیا اور اس کی ایک ارتقائی اور ترقی یافتہ شکل کو پیش کیا جس میں علم سیاسیات کو مفصل انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

یونان میں جمہوریت کا تصور بہت عام فہم اور سادہ تھا، کیونکہ قدیم زمانہ میں یونان کے تمام شہر بذاتِ خود ایک مستقل ریاست تھے، یونان میں جو سب سے بڑا آبادی والا شہر تھا وہ ایتھنز "Athens" تھا، جس کی آبادی دس ہزار 10000 کے لگ بھگ تھی،

A system made possible by the fact that a city-states population rarely exceeded 10,000 persons and that women and slaves enjoyed no political right[iv]

باقی تمام شہر اسپارٹا Sparta وغیرہ کی آبادی تو اس بھی بہت کم ہوتی تھی، اب یہاں پر جمہوریت اس طرح سے رائج تھی کہ بادشاہ کسی بڑے معاملہ میں عوام سے رائے معلوم کرنا چاہتا ہے، تو اس کے لیے وہ تمام لوگوں کو میدان میں جمع کرتا تھا، اور وہاں ریاست کے تمام باشندوں کا ایک وقت میں میدان میں جمع ہونا ممکن تھا کیونکہ کسی بھی ریاست کی آبادی دس ہزار سے زیادہ نہیں تھی، پھر جب عوام میدان میں جمع ہو جاتی تو ان کے سامنے اس معاملہ کو واضح کیا جاتا تھا جس پر عوام کی رائے مطلوب ہوتی، اس کی خوبیوں اور خامیوں کے پہلو عوام کے سامنے رکھ دیے جاتے تھے، پھر اس کے بعد اس معاملے پر عوام کی ووٹنگ ہوتی جس سے ان کی رائے معلوم کی جاتی تھی، کہ جو اس قانون کے پاس ہونے کے حق میں ہیں وہ ہاتھ کھڑا کریں، اس کے بعد گنتی ہوتی تھی اور جس طرف کا پلڑہ بھاری ہوتا تھا بادشاہ اس کو منظور کر لیتا، اور وہ ایک ایکٹ بن جاتا تھا، اسی تصور کو جمہوریت کا حقیقی تصور کہا جاتا ہے جس میں تمام لوگوں سے رائے لی جائے اور کثرت رائے کی بنا پر کسی ایک جانب کو ترجیح دے کر اس کو ایک قانون کی شکل دے دی جائے۔

یہ جمہوریت (Democracy) کا سب سے پہلا اور واضح تصور تھا جو یونان میں رائج تھا، انسائیکلوپیڈیا بریٹانیکا (Encyclopedia Britannica) میں جمہوریت کی مختلف اور رائج اقسام میں سب سے پہلے اسی قسم کو بیان کیا گیا جسے Direct Democracy کہا جاتا ہے، پھر اس کے بعد جمہوریت کی دوسری اقسام کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے جو قدیم زمانے میں رائج رہی ہیں، ملاحظہ ہوں:

"The term has several different senses in contemporary usage:(1) Form of government in which the right to make political decision is exercised directly by the whole body of citizen acting under procedure of majority rule, usually known as directly democracy[v];

ترجمہ: جمہوریت مختلف زمانوں میں مختلف طرزِ حکومت کے ذریعے رائج رہی ہے، پہلی قسم: گورنمنٹ کی وہ قسم ہے جس میں سیاسی معاملات میں قانون سازی براہِ راست تمام شہریوں کا حق تھا، جس میں ان سے رائے لی جاتی اور کثرتِ رائے پر فیصلہ کیا جاتا تھا، عام طور پر اسی کو براہِ راست جمہوریت کہا جاتا ہے۔

یہ جمہوریت کا پہلا اور واضح تصور تھا، جس کو حقیقی جمہوریہ بھی کہا جاتا ہے، لیکن جمہوریت کا یہ تصور اور بڑے ممالک میں اس کا نفاذ ممکن نہ تھا، کیونکہ براہِ راست عوام کا سیاسی معاملات میں دخل اندازی کرنے کا تصور اس ریاست میں تو ممکن ہو سکتا ہے، جہاں پر آبادی تھوڑی ہو، البتہ بڑی ریاستوں میں جمہوریت کا یہ طریقہ ممکن نہ تھا، اسی لیے جوں جوں آبادی میں اضافہ ہوتا گیا، اور یونان کی تمام ریاستیں آپس میں گتھم گتھا ہوتی گئی تو جمہوریت کا یہ تصور بھی عملاً مفقود ہوتا گیا، تو اب عوام کو ایک میدان میں جمع کرنا ممکن نہ رہا کیونکہ کیسے ہزاروں میل پر پھیلے لاکھوں لوگوں کو ایک میدان میں جمع کیا جا سکتا تھا، تو پھر رفتہ رفتہ سادہ اور حقیقی جمہوریت کی جگہ (Representative Democracy) نمائندگانِ جمہوریت نے لی۔

یہ جمہوریت کا دوسرا تصور تھا، جو آبادی کی کثرت کی وجہ سے قدیم زمانے میں روم و یونان میں رائج رہا، اور جمہوریت کی یہی تصور آج پوری دنیا میں رائج ہے، اس نظامِ جمہوریت میں نہ تو حکومت کے تمام باشندگان کو جمع کر کے رائے لی جاتی ہے اور نہ ہی ایسا کرنا ممکن ہوتا ہے، اس میں عوام براہِ راست حکومت سے اپنے مطالبات نہیں منوا سکتی، بلکہ وہ اپنی طرف سے اپنے مطالبات کے لیے چند نمائندگان کا انتخاب کرتے ہیں جو حکومت میں عوام کی نمائندگی کر کے ان کے حقوق کا تحفظ کرتی ہے، اور ان کے مفادات کو پیشِ نظر رکھ کر بل منظور کرتی ہے۔

انسائیکلوپیڈیا بریٹانیکا (Encyclopedia Britannica) میں جمہوریت کی دوسری قسم کا تذکرہ ان الفاظ میں ملتا ہے:

" A form of government in which the citizens exercise the same right not in (2) persons but through representatives chosen by and responsible to them, known as a representative democracy[vi]"

ترجمہ: جمہوریت کی دوسری صورت جس میں شہریوں کو قانون سازی کا حق تو ہوتا ہے لیکن ہر شخص کی بجائے انہی کی طرف سے منتخب شدہ نمائندوں کو ہوتا ہے، اس کو (Representative Democracy) نمائندہ جمہوریت (اس میں منتخب لوگ پوری عوام کے نمائندہ ہوتے ہیں) کہا جاتا ہے۔

لبرل جمہوریت (Liberal Democracy)

اس کے بعد لیبرل اور سیکولر جمہوریت وجود میں آتی ہے. جمہوریت کی ان دونوں قسموں میں کوئی بھی واضح فرق سوائے اس کے نہیں ہے کہ نمائندہ جمہوریت (Representative Democracy) میں مذہب سے آزادی کے الفاظ نہیں ہیں۔ لیکن اس میں بھی جو فیصلے ہوں گے وہ بھی کثرتِ رائے کی بناء پر ہوں گے چاہے وہ مذہب کے خلاف ہوں یا موافق۔ جمہوریت کا اس سے کوئی لینا دینا نہیں ہے۔ عوام ہی کو تمام چیزوں پر قدرت ہے، لیکن لیبرل جمہوریت میں آزادی اور حدود کی پابندی نہیں ہے، اس آزاد فلسفہ تصور میں تمام فلسفہ زندگی کو آزادی حاصل ہے، اس میں بغیر کسی قید و بند کے تمام اختیارات عوام کے سپرد کر دئے گئے ہیں۔،، جن ممالک میں لیبرل اور سیکولر جمہوریت ہے، ان ممالک میں ایک قانون (Constitution) بنایا جاتا ہے، جو چند انسانوں کے غور و خوض کا نتیجہ ہوتا ہے، ان ممالک میں اس انسانی قانون کو حدِ فاصل بنایا جاتا ہے کہ آئین کی پاپندی تمام شہریوں پر لازم ہے، اسیطرح عوام کو آزادیِ اظہارِ رائے اور مذہب سے آزادی کا اختیار بھی دیا گیا ہے ، مغربی فلسفہ تصور کی بنیاد زیادہ تر ماڈرنزم پر قائم ہے۔

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں لیبرل جمہوریت کا تذکرہ ان الفاظ میں ملتا ہے:

Form of government usually a representative democracy, in which the powers of majority are exercised within a frame work of constitutional restraints designed to guarantee all citizen the enjoyment of certain individual or collective rights, such as freedom of speech and religion, known as liberal or constitutional democracy.

ترجمہ: دورِ حاضر کی لیبرل اور سیکولر جمہوریت کے بانی مبانی تین فرانسیسی فلسفی ہیں.

والٹائر، مونٹیسکو، (Charles De Montesquieu)1689-1755 روسو، (Jean Jacques Rousseau)1712-1778 جن کے افکار و نظریات پر آج کی لبرل اور سیکولر جمہوریت کھڑی ہے۔

ان تین فلاسفہ نے کے نظریات نے چند تبدیلیوں کے ساتھ یورپ کو انہی سیاسی نظریات پر کھڑا کر دیا، جو قدیم یونان میں رائج تھے، قدیم جمہوریت کے تقریبا دو ہزار سال (2000) کے وقفے کے بعد یورپ از سرِ نو جمہوری بنیادوں پر کھڑا ہوا، جس کو لبرل اور کونسٹیٹیو شنل جمہوریت (liberal, constitutional democracy) کہا جاتا ہے:

"Greek Democracy was a brief historical episode that had little direct influence on the practice of modern states: from the fall of Greek city-states to the rise of modern constitutional democracy, there was a gap of 2000 year in the practice of democracy

یہ جمہوری نظام بھی درحقیقت پاپائیت، اور بادشاہت کا ری ایکٹیو فعل تھا، لہٰذا ان تینوں فلاسفہ کے جتنے بھی نظریات ہیں مذہب، اور بادشاہت کے خلاف ہی گھومتے ہیں، وولٹائر نے مذہب کا انکار کیا ہے۔ اور اسکی مخالفت میں بہت کچھ لکھا ہے۔ مونٹیسکو نے بادشاہوں کے غیر معمولی اختیارات پر کاری ضرب لگائی اور تفریقِ اختیارات کا فلسفہ پیش کیا، اور روسو کے نظریات نے تو بادشاہت اور مذہب دونوں کو پاؤں تلے روند ڈالا، عوام کو ہی تمام اختیارات سونپ دیئے۔(9)

یہ تھے جمہوری نظام کے مختلف ادوار جو قدیم زمانہ سے دنیا میں رائج رہے۔ اب جدید جمہوریت کے بانی مبانی فلاسفہ کے نظریات کو مختصرا پیش کرتے ہیں، جن کے نظریات کا سہارا لے کر سیکولر جمہوریت دنیا میں پروان چڑھ رہی ہے۔

وولٹائر Voltaire: (1694-1778)

سب سے پہلا شخص ہے جس کے سیاسی نظریات کو قبولِ عام حاصل ہوا، یہ شخص مذہب کا ناکری تھا۔ جسے ملحد بھی کہا جاتا ہے، اس کے نزدیک مذہب کے حق و باطل کا سوال اٹھانا ایک بے کار سی بات تھی، اس کی وفات کے تقریبا ایک سال بعد انقلاب فرانس آیا اور اس کے نتیجے میں بادشاہت کا زور ٹوٹنا شروع ہوا، انقلابِ فرانس سے پہلے فرانس میں بادشاہت ڈکٹیٹر شپ تھی، فرانس کے بادشاہ عوام کے ساتھ ایسا سلوک کرتے تھے جو کسی انسان کے ساتھ تو درکنار کسی حیوان کے ساتھ بھی روا نہیں رکھا جاسکتا، اس ظلم کی انتہاء سے یورپی عوام کے صبر کی آخری کڑی بھی ٹوٹ گئی اور انہوں نے ان مظالم کے خلاف جن میں وہ برسوں سے پس رہے تھے ڈٹ جانے کے لیے پر تولنا شروع کر دیے، ان کے لیے اس تحریک میں جن فلسفیوں کے نظریات نے اندھیرے میں چراغ کا کام دیا ان میں سر فہرست "وولٹائر" کا نام ہے، اس شخص نے مذہبی اشرافیہ کے غیر منصفانہ اور ظالمانہ رویوں کی بناء پر مذہب کے خلاف ذہن سازی شروع کر دی، اور کہا کہ مذہب کا ریاست سے کوئی تعلق نہیں مذہب انسان کا ایک ذاتی اور نجی معاملہ ہے۔ جس کو اس نے اپنی تسکین کے لیے اختیار کیا ہے، لہٰذا کسی کی ذاتی تسکین کو باقاعدہ ریاست کا حصہ نہیں بنایا جاسکتا، اور نہ ہی کسی کی خواہش کو سب پر مسلط کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی کسی کو یہ اختیار ہے کہ وہ کسی کے مذہب کو تنقید کا نشانہ بنائے، کیونکہ یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی شخص اپنی تسکین کے لیے جیسی چاہے عمارت تیار کرے اور اس میں سکونت اختیار کرے جس طرح اس کا گھر اور عمارت اس نے اپنی ذاتی تسکین کے لیے بنائی ہے اور اس میں کوئی شخص اس پر تنقید نہیں کر سکتا بعینہ اسی طرح مذہب بھی اس نے اپنی ذاتی تسکین کے لیے اختیار کیا ہے، لہٰذا جس کو جس مذہب میں بھی سکون و راحت میسر ہو وہ اس کو اختیار کر سکتا ہے اس پر کوئی ملامت نہیں ۔(10)

وولٹائر کا مذہب کے بارے میں نقطہ نظر

Voltaire and the Marquise analysed the Bible and conclude that much of its content was dubious. Voltaire critical views on religion led to his belief in separation of church and state and religious freedom, ideas that he had formed after his stay in England[vii]

وولٹائر کے اس نظریہ کو عوام میں قبولِ عام حاصل ہوا، کیونکہ ایک طرف تو عوام مذہب سے بہت زیادہ متنفر ہو چکی تھی جو بھی شخص مذہب کے خلاف آواز بلند کرتا تو عوام بغیر کسی تامل و تدبر کے اس شخص کے پیچھے چلتے تھے، لہٰذا وولٹائر کے اس نظریہ کو "مذہب اور ریاست جدا جدا ہیں" کو قبول عام حاصل ہوا کیونکہ مذہبی اشرافیہ اور بادشاہوں نے ملکر عوام کی ناک میں دم کر رکھا تھا، مذہبی اشرافیہ اور ان کی بے جا جکڑ بندیوں سے آزادی دلانے والا شخص وولٹائر تھا، حضرت مفتی عثمانی صاحب دامت برکاتہم "اسلام اور سیاسی نظریات" میں وولٹائر کے ملحدانہ نظریہ کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"وولٹائر کا خصوصی امتیاز یہ ہے کہ اس نے مذہب کے بخیے ادھیڑے، اور یہ دعویٰ کیا کہ جتنے آسمانی مذاہب ہیں سب تحریف شدہ ہیں م اور اصل میں انسان کا ایک ہی مذہب ہونا چاہیے ،اور وہ فطری مذہب ہے ۔اس کو انگریزی میں(natural religion) کہتے ہیں۔ بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ وولٹائر نے خدا کے وجود میں تشکیک کا بیج بو دیا، لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ اس نے یہ کہا کہ انسان کا ایک فطری مذہب ہونا چاہیے۔اس کے تحت انسان پیدا ہونے کے بعد خدا کے وجود کو تسلیم کرلے تو کرلے۔اس کے بعد عام مذاہب میں جو اخلاقی یا قانونی ہدایات دی جاتی ہیں، ان کی اور مذہبی نظاموں کی کوئی دائمی حیثیت نہیں ہے۔

وولٹائر کے نظریات کی دوسری بات جو سب سے زیادہ مؤثر ہوئی وہ یہ کہ مذہب انسان کا ایک ذاتی معاملہ ہے، اور کوئی اتھارٹی دوسرے کو کسی مذہب کے حق اور باطل ہونے کا قائل نہیں کرسکتی۔بلکہ یہ انسان کا ذاتی معاملہ ہے، وہ اگر چاہے تو بت پرستی کرے، اور اگر چاہے تو آسمانی مذہب اختیار کرے، اور چاہے تو یہودی بن جائے یا عیسائی بن جائے۔[viii]

وولٹائر خدا کو مانتا تھا لیکن وہ اس بات کا انکاری تھا کہ خدا ہماری ذاتی اور نجی زندگی میں دخل اندازی دے سکتا ہے، اس وجہ سے وہ کسی بھی آسمانی مذہب کو ماننے کے لیے تیار نہ تھا ۔

وولٹائر کا خدا کے بارے میں نظریہ:

Voltaire believed in a God but did not believe in a God personally involved in people lives. Like the Christian God. This is called Deism[ix].

یہ تھا وولٹائر کا" نظریہ "جس نے عوام کے دل و دماغ سے مذہب کا طوق باہر پھینک دیا، اور جب مذہب ریاست سے الگ کر دیا گیا تو رفتہ رفتہ لوگوں نے اپنی نجی زندگی سے بھی مذہب کو نکالنا شروع کر دیا اور لوگوں نے اپنی بقایا زندگی کا رخ الحاد کی طرف پھیر دیا۔

اب لوگوں کے قلوب سے مذہبی اشرافیہ کا خوف تو کم ہو گیا تھا، کیونکہ یہ لوگ مذہبی اجارہ داری کی بناء پر ریاستوں پر قابض بنے بیٹھے تھے اور "وولٹائر" نے مذہب کو ریاست سے ہی نکال دیا تھا، اب بادشاہوں کا غیر معمولی اختیار بھی عوام کے لیے دردِ سر بنا ہوا تھا، اس کے خلاف کام کرنے والی شخصیت کا نام ہے "مونٹیسکو" ذیل میں اس کا مختصر تذکرہ کرتے ہیں۔

مونٹیسکو۔**(Charles De Montesquie1689-1755)**

جمہوریت کی صورت گری میں جس شخصیت کا بہت بڑا کام ہے وہ ہے مونٹیسکو، آج کی ساری جمہوریت اس کے بنائے ہوئے قوانین پر کھڑی ہے، جمہوریت کے متعلق اس کا جو نظریہ تھا وہ مذہب کے خلاف نہ تھا بلکہ اس شخص نے بادشاہوں کے وسیع اختیارات پر کاری ضرب لگائی ،کیونکہ دو طبقے تھے جنہوں نے عامۃ الناس کی آزادی میں سخت رکاوٹیں کھڑی کی ہوئی تھی، ایک مذہبی اشرافیہ: ان کے اختیارات کو تو "وولٹائر "نے چیلنج کیا اور ان کے خوف و دبدبہ کو عوام کے قلوب سے نکال دیا، اب دوسرا طبقہ بادشاہوں کا تھا ان کے خلاف علم بلند کرنے والا شخص مونٹیسکو تھا، اس نے ایک کتاب لکھی the spirit of lawاس کتاب میں اس نے تفریق اختیارات کا تصور پیش کیا جس کو پوری دنیا میں قبول کیا گیا اور آج کی جمہوریت اس کے اسی تفریق اختیار کے تصور پے کھڑی ہے، اس کتاب پر اس نے انتہائی جان فشانی سے کام کیا اس کام کا اندازہ اس کی اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب اس نے اپنی کتاب کا اختتام کیا تو پھر اس نے یہ الفاظ لکھے:

This work has nearly killed me, and now I shall rest and no labor more[x]"

ترجمہ: قریب تھا کہ یہ کام میری جان لے لیتا، اب میں صرف آرام ہی کروں گا۔

اس کے اس جملہ سے اس بات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس نے بادشاہوں کے ان مظالم کے خلاف اور دنیا میں امن وامان کی بحالی کے لیے کس قدر محنت ومشقت سے کتاب لکھی اس کا کہنا یہ تھا کہ دنیا میں جتنے بھی فسادات وناانصافیاں ہوئی ہیں ان کی وجہ بادشاہوں کے غیر معمولی اختیارات تھے، بادشاہ ہی قانون بناتا تھا وہی نافذ بھی کرتا تھا اور اگر کوئی مسئلہ کھڑا ہو جائے تو اس کے لیے فیصلہ بھی بادشاہ سے ہی کروانا ہوتا تھا ،اب اگر بادشاہ کا کوئی فعل جس سے عوام کی حق تلفی ہو رہی ہے تو عوام اپنے اس حق کے مطالبہ کے لیے بادشاہ سے ہی رجوع کرتی تھی لہٰذا اس صورت میں بادشاہ ہی مطلق العنان حاکم رہے گا اور جس طرح سے چاہے گا عوام کے ساتھ سلوک کرے گا اور عوام پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے گا تو دنیا میں امن قائم نہیں ہو سکتا، اس لیے دنیا میں امن قائم کرنے کی صورت یہی ہو سکتی ہے کہ بادشاہ کے اختیارات کو تین حصوں میں منقسم کر دیا جائے:

- قانون سازی کا اختیار
- ملک کا نظم چلانے کا اختیار
- خلاف قانون کام کرنے پر اس تنازعہ کا فیصلہ کرنے کا اختیار

لہٰذا جمہوری ممالک میں تینوں اداروں کا وجود ہے اور ان میں سے ہر ایک ادارہ آزاد اور خود مختار ہے، قانون سازی کا اختیار "مقننہ" کو ہے اور اس کو "پارلیمنٹ" بھی کہتے ہیں، پھر قانون بننے کے بعد اس قانون کے مطابق انتظام چلانے والے ادارے کو "ایگزیکٹیو" یا "انتظامیہ" کہا جاتا ہے، پارلیمانی نظام میں جس کا سربراہ "وزیر اعظم" اور صدارتی نظام میں "صدر" ہوتا، پھر تیسرا مرحلہ آتا ہے قانون کے مطابق تنازعات کے حل کرنے کا معاملہ، اس کی ذمہ داری "عدلیہ" پر ہوتی ہے۔

لہٰذا جب اختیارات تقسیم ہو گئے تو بادشاہوں کی مطلق العنانی بھی ختم ہو گئی اور عوام کافی حد تک آزاد ہو گئی تھی، کیونکہ مذہبی اشرافیہ کا زور "وولٹائر" نے توڑ دیا تھا، اور بادشاہوں کے اختیارات کو "مونٹیسکو" نے محدود کر دیا تھا، اب عوام کو بالکلیہ آزاد کرنے کے لیے اور شتر بے مہار چھوڑنے کے لیے فرانس ہی کے تیسرے فلسفی "روسو" نے حصہ لیا، اور اس کے نظریات سے بھی لوگوں کا رخ الحاد و دہریت کی طرف پھر گیا۔

روسو:۔(Jean Jacques Rousseau 1712-1778)

یہ فلسفی بھی فرانس ہی کا رہنے والا تھا، اس شخص نے بادشاہوں کے خلاف اور عوام کے حق میں لکھا، مفتی تقی عثمانی نے اپنی کتاب "اسلام اور سیاسی نظریات" میں روسو نظریہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "روسو پہلا شخص تھا جس نے یہ کہا کہ معاہدہ عمرانی کا نتیجہ یہ نہیں ہے کہ مطلق العنان حکومت قائم ہو، بلکہ معاہدہ عمرانی کا نتیجہ یہ ہے کہ ایسی حکومت قائم ہو جس میں افراد کو آزادی ہو، اور حکومت افراد کی نمائندہ ہو۔ کیونکہ انہوں نے حکومت کے حق میں اپنی ذاتی حقوق سے جو دستبرداری اختیار کی ہے وہ اس وجہ سے اختیار کی ہے کہ یہ حکونت ہمارے مفادات اور ہماری آزادیوں کا تحفظ کرے گی۔ لہٰذا معاہدہ عمرانی کا تقاضا یہ ہے کہ عوام اپنی نمائندہ حکومتیں قائم کریں، اور فرد کے مفادات کا تحفظ کیا جائے۔ اس طرح روسو کے نظریے میں دو چیزیں ہیں: ایک فرد کی آزادی پر زور دینا ،اور افراد کی نمائندہ حکومت۔"[xi]

روسو کی وفات کے تقریباً گیارہ سال بعد انقلاب فرانس آیا، اور اس انقلاب کا محرک ان تینوں فلسفیوں کے نظریات تھے، روسو کے نظریات نے تمام لوگوں کو بالکلیہ طور پر آزاد کر دیا، اس کا نظریہ یہ تھا کہ بادشاہ کی اپنی ذات میں کوئی حیثیت نہیں بلکہ یہ تو عوام کے نمائندے ہیں اور عوام کی مرضی اور رائے کے بغیر بادشاہ کچھ بھی نہیں کر سکتا جو بھی کام ہو گا وہ عوام کی رائے اور خواہش کے مطابق ہی ہو گا بادشاہ کو یہ اختیار

نہیں کہ وہ عوام کی اچھائی یا برائی کا فیصلہ کرے، بلکہ یہ عوام کا حق ہے اور وہی اپنے لیے اچھائی یا برائی کی تعیین کریں گے عوام کے اس حق میں کوئی مذہب کسی قسم کی بھی رکاوٹ نہیں ڈال سکتا۔ یہ تھا "روسو" کا نظریہ، جس پر آج پوری دنیا کی سیکولر جمہوریت قائم ہے، کہ اس شخص نے حق وباطل کا معیار عوام کی رائے کو قرار دیا، یہ نظریہ مذاہب سماویہ کے مخالف تھا، ان تینوں فلاسفہ میں سے جس کے نظریہ نے سب سے زیادہ دینی روح کو متاثر کیا وہ روسو" ہے، روسو نے عوام کو خدائی اختیارات سونپنے میں ذرہ بھی تامل نہ کیا، اس کے اس نظریہ نے نہ صرف لوگوں کی دینی ساکھ کو متاثر کیا بلکہ آج پوری دنیا میں جہاں بھی معاشرتی اصولوں سے بے راہ روی ہے اس تصور کے پیچھے روسو کا مفروضہ ہے، عوام کی آزادی رائے کے سامنے کسی اصول و قواعد کو بے اثر ٹھہرایا گیا ہے۔

تنقیدی جائزہ۔

مذاہبِ سماویہ اور سیکولر نظام میں یہ بنیادی فرق ہے کہ مذاہب سماویہ کے ہاں اچھائی وبرائی کی حدود متعین ہیں اور ان کی تعیین میں خالق کے اصول کی اہمیت ہے۔ کیونکہ انسان مخلوق ہے اس لیے وہ خالق کی حیثیت کو چیلنج نہیں کر سکتا، جبکہ سیکولر جمہوریت اور لبرل ازم کے تصور میں مخلوق اس کائنات میں نمائندہ حیثیت میں ہے وہ ہی اپنے لئے اچھا برا اختیار کر سکتا ہے۔ ۔روسو" نے لامحدود اختیارات عوام کی جھولی میں ڈال دیئے، اب عوام کو جب غیر محدود اختیارات سونپے گئے تو پھر مسئلہ یہ کھڑا ہو گیا کہ جس طرح عوام کی سوچ وفکر بدلتی رہتی ہے اسکی کوئی حدود متعین نہیں، اس کے نتیجے میں اچھائی وبرائی کی حدود متعین نہیں رہتی کیونکہ اس کا اختیار بھی روسو کے "نظریہ" کے مطابق عوام کے پاس ہے کہ کسی شے کی اچھائی یا برائی کا فیصلہ عوام کرے گی جس کا مطلب یہ ہے کہ ااچھائی یا برائی بنفسہ کوئی شے نہیں بلکہ ہر شے خارج سے اثرات قبول کر کے کبھی وہ اچھی ہوتی ہے اور پھر وہی زمانے کی تبدیلی سے بری بن جاتی ہے، زمانے کی تبدیل سے مراد عامۃ الناس کی رائے ہے کہ عوام کسی چیز کی اچھائی یا برائی کا فیصلہ کرے گی، آج عوام اگر کسی چیز کو اپنی کثرتِ رائے سے صحیح مانتی ہے تو وہ صحیح تصور کی جائے گی، اگرچہ خارج میں اس کی قباحت کتنی ہی مسلم کیوں نہ ہو اور اس کے برعکس کسی اچھی شے کو کثرتِ رائے برا تصور کرے اور وہ در حقیقت اچھی ہو تو پھر بھی وہ اچھی کہلانے کی مستحق نہیں، کیونکہ عوام نے اس کو برا مان لیا ہے، یہ نظریہ دینِ اسلام کے صریح مخالف ہے کہ ہر امر میں حق وباطل کا معیار عوام کو قرار دے دیا جائے، اور خالق سے خالق کا حق چھین کر مخلوق کے سپرد کر دینا انصاف وعقل کیخلاف ہے۔ دنیا بھر میں انسانی اجتماعی شعور و مذاہب میں خدائی راہنمائی کو ہمیشہ مانا گیا ہے۔ اور اس کے خلاف تصور کے نقصانات بھی واضح ہیں، جس کا پوری دنیا میں مشاہدہ کیا گیا ہے، سیکولر جمہوریت میں اس قسم کی سینکڑوں مثالیں ملتی ہیں جس میں عوام کی کثرتِ رائے پر کسی غلط اقدام کو سند جواز سے تو دیا گیا اور قانونی طور پر اس کو منظور بھی کیا گیا، لیکن سروے اور تحقیق نے یہ ثابت کیا ہے کہ ان کے اس اقدام سے ان مملک کو اخلاقی ومعاشرتی نقصان سے دوچار ہونا پڑا۔

مفتی تقی عثمانی نے اپنی کتاب "اسلام اور سیاسی نظریات" میں سیکولر جمہوریت کے ذیل میں برطانوی پارلیمنٹ کے ایک واقعہ کا تذکرہ کیا، جس میں ہم جنس پرستی کو عوام کی کثرتِ رائے کی تائید کی بناء پر قانونی طور پر منظور کیا گیا اور اس کو صحیح تسلیم کیا گیا، عوام کی کثرت کی بناء پر اس کو صحیح ماننا پڑا،

> "برطانیہ کی پارلیمنٹ نے ہم جنس پرستی کو سندِ جواز دی اور اس کے جواز کا قانون تالیوں کی گونج میں منظور کیا، جس وقت برطانیہ کی پارلیمنٹ میں یہ بل پیش ہوا تو سب لوگ اس کے حامی نہیں تھے اختلافِ رائے موجود تھا اس اختلاف رائے کو دور کرنے کے لیے ایک کمیٹی بنائی گئی اس کمیٹی کو" کہا جاتا ہے۔ وہ کمیٹی اس لیے بنائی گئی تھی کہ وہ اس معاملہ میں رائے عامہ کا اندازہ لگائیں اور جو مفکرین اور دانشور ہیں ان سے تبادلہ خیال کریں اور بالآخر یہ رپورٹ پیش کرے کہ ایوان رائے عامہ کا جائزہ لینے کے بعد اور تمام متعلقہ حلقوں سے گفتگو کرنے کے بعد کس نتیجے پر پہنچی، اس کمیٹی کی رپورٹ بڑی

عبرت ناک ہے اس رپورٹ کی کمیٹی نے جو باتیں کہی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم جنس پرستی ایک برائی ہے لیکن ہماری دشواری یہ ہے کہ ہم نے اپنے پروگرام کو اچھائی یا برائی پر تعمیر نہیں کیا ہے بلکہ اس بنیاد پر تعمیر کیا ہے کہ عوام اپنے لیے قانون طے کرنے کیلیے آزاد ہیں۔ جب ہم نے اصول تسلیم کر لیا تو قانون کا دائرہ کار اخلاق کے دائرہ کار سے بالکل الگ ہو گیا قانون اور چیز ہے اور اخلاق اور چیز ہے، اخلاق انسان کا ذاتی معاملہ ہے، اور قانون رائے عامہ کا مظہر ہے۔ آزادی کا مظہر ہے۔ لہٰذا جب تک معاشرے میں ایسی کوشش نہیں کی جاتی جو بد اخلاقی یا گناہ کو جرم کے مساوی قرار دے دے، تو اخلاق اور قانون کا دائرہ کار الگ رہے گا اور یہ قانون کا کام نہیں کہ وہ خیر اور شر کا فیصلہ کرے۔ کون سی چیز اچھی ہ اور کون سی چیز بری ہے لہٰذا ہم اس قانون کی حمایت کرنے پر مجبور ہیں، جب رائے عامہ اس کے جواز کی طرف جاری ہے تو ہم اس پر یہ رائے دیں گے یہ قانون بنا دیا جائے۔ چنانچہ اس کمیٹی کی رپورٹ کی بنیاد پر برطانیہ دارالعوام نے یہ فیصلہ کر دیا کہ ہم جنس پرستی قانوناً ٹھیک ہے" [xii]

سیکولر اور لبرل جمہوریت جو عام لوگوں پر بادشاہوں کی سختیوں اور بے جا پابندیوں کے خلاف وجود میں آئی تھی اور بادشاہوں کے مظالم کاری ایکٹیو فعل تھا، اس لیے اس جمہوریت کے متصورین اس ری ایکٹیو فعل میں اعتدال کا دامن ہاتھ سے چھوڑ بیٹھے۔ عام لوگ جس آزادی کیساتھ جینا چاہ رہے تھے، اسمیں کسی درجہ آزادی ضرور حاصل ہو گئی لیکن یکسر ڈیوائن لاء کی مخالفت میں تفریط کا مظاہرہ کیا گیا۔ لوگوں کو آزادی کے تصور میں کھلا چھوڑا گیا، سیکولر جمہوریت کی آزادی سے متعلق مغرب میں بہت سی مخالف تحریکیں اور تحریریں لکھی گئی ہیں۔ عوامی پریشانی کا کماحقہ مداوا تاحال تسلی بخش طریقے سے نہ ہو سکا۔ اسکا نتیجہ ہے کہ فیمینیزم، لبرلزم، طرح کی بہت سے تحریکیں پنپ رہی ہیں۔ ان ترقیوں کے ساتھ مغربی ممالک میں جرائم اور لاقانونیت کی شرح بھی تسلی بخش نہیں۔ (15)[xiii]

اسلامی جمہوریت (Islamic Democracy)

اسلامی جمہوریت دراصل اس دور کی اصطلاح ہے جب سے جمہوری طرز حکمرانی کا آغاز ہوا ہے۔ حکمرانی کا جمہوری طور طریقہ بہت سے گوشوں میں اسلامی بنیادی اصولوں سے متصادم ہونے کے باعث دونوں طرز حکمرانی بہت سی چیزوں میں ایک دوسرے سے مطابقت نہیں رکھتی۔ اس لئے عوام پر حکمرانی کے لئے حاکم کو کن صلاحیتوں کا حامل ہونا چاہئے یہ اسلامی حکمرانی کا بنیادی اصول ہے۔ اس لئے اسلامی طریقہ حکمرانی میں بنیادی تصور خلافت کا ہے۔ جسکا مطلب ہے کہ عام اسلامی اصولِ حکمرانی یہ ہے کہ ہر قانون و ضابطہ جو خدائی قانون سے متصادم نہ ہو ایسا طرز حکمرانی اسلامی حکمرانی کہلاتی ہے، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا چاہے اسکا نام جمہوریت رکھا جائے یا خلافت وغیرہ۔ شاہ ولی اللہ جو برصغیر کے عظیم اسلامی اسکالر و مفکر جانے جاتے ہیں وہ اپنی کتاب ازالۃ الخفاء میں لکھتے ہیں۔

هی الرياسة العامة فی التصدی لاقامة الدين باحياء العلوم الدينية واقامة اركان الاسلام والقيام بالجهاد وما يتعلق بہ من ترتيب الجيوش والفرض للمقاتلة واعطائهم من الفيئ والقيام بالقضاء واقامة الحدود ورفع المظالم والأمر بالمعروف والنهی عن المنكر نيابة عن النبی صلی الله عليہ وسلم۔" (ازالۃ الخفاء ص:۲

ترجمہ:... "خلافت کے معنی ہیں دِین کو قائم (اور نافذ) کرنے کے لئے مسلمانوں کا سربراہ بننا۔ دِینی علوم کو زندہ رکھنا، ارکانِ اسلام کو قائم کرنا، دفاع کو قائم کرنا اور متعلقاتِ دفاع کا انتظام کرنا، مثلاً: لشکروں کا مرتب کرنا، فوجیوں کو وظائف دینا اور مالِ غنیمت ان میں تقسیم کرنا، قضاو عدل کو قائم کرنا، حدودِ شرعیہ کو نافذ کرنا اور مظالم کو رفع کرنا، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا۔"

جمہوریت نظامِ حکومت میں عوام کے چنے ہوئے نمائندوں کی اکثریت رکھنے والی سیاسی جماعت حکومت چلاتی ہے اور عوام کے سامنے جواب دہ ہوتی ہے۔ جبکہ اسلام کے نظامِ خلافت اور جمہوریت کا یہ فرق دونوں اصول حکمرانی کو الگ کر دیتا ہے، دوسرے لفظوں میں خلافت خدائی قانون کی نمائندگی کا تصوّر پیش کرتی ہے، اور جمہوریت عوام کی نیابت کا نظریہ پیش کرتی ہے۔

خلافت طریقہ حکمرانی، مسلمانوں کے سربراہ پر خدااور پیغمبرؐ کے قانون قائم اور نافذ کرنے کی ذمہ داری عائد کرتی ہے، پوری زمین کامالک حقیقی اللہ تعالی ہے۔ اسپر اللہ کا کا بتایا گیا قانون نافذ اور قائم کیا جائے گا، لوگوں پر اللہ تعالیٰ کے مقرّر کردہ نظام عدل کو نافذ کیا جائے، جبکہ جمہوریت میں عوامی مینڈیٹ اور ضرورت کو مد نظر رکھا جاتا ہے۔ کسی بھی عوامی ضرورت اور خواہش کو پورا کرنے کے لئے قانون سازی اور عوامی نمائندگان کی رائے دیکھی جاتی ہے۔

اسلامی حکمرانی میں حکمران کے لئے خاص شرائط ہیں، جیسے مسلمان ہونا، عاقل وبالغ((Adult and Mature ہونا، سلیم الحواس ہونا، اہم منصب کے لئے مرد کا ہونا، جرائم کا مرتکب نہ ہونا، اَحکام شرعیہ کا جاننے والا ہو۔

جمہوریت میں عوامی اکثریت حاصل کرنے کو دیکھا جاتا ہے۔ مذہب یا مذہبی شرائط کو اسمیں کوئی دخل نہیں ہوتا۔

اسلامی حکومت میں حکمران کے لئے آئینی دستاویز قرآن وحدیث ہے، اور اگر قرآن وحدیث سے کوئی راہنمائی کسی مسئلے میں نہ ملے تو اسکے بعد اجتہاد کیا جائیگا۔ جس کی پابندی راعی اور رعایا دونوں پر لازم ہو گی۔ جبکہ جمہوریت میں سب بڑا حوالہ مملکت کا آئین و قانون ہے، یہ سب سے اہم دستاویز ہے۔ اور تمام اختلافی اُمور میں آئین و دستور کی طرف رُجوع لازم ہے، انتظامیہ اور عدالتیں اسی آئین کی روشنی میں فیصلے صادر کرنے کی پابند ہیں۔۔ اسمیں اسقدر سقم اور عیب ضرور ہے کہ عوامی منتخب نمائندے اگر چاہیں تو مطلوبہ اکثریت کی بنیاد پر اقلیت کے خلاف قانونِ مخالفت، ترمیم و تنسیخ کرسکتے ہیں۔ آئین اور قانون میں اسکی مشروط اجازت ہے۔(۱۸)

جمہوریت اور اسلامی طرز حکمرانی کا تقابلی جائزہ۔

اس موضوع سے متعلق دونوں طرز حکمرانی کے نقائص و فوائد سے متعلق یقیناً مختلف نقطہ نظر پائے جاتے ہیں۔ جمہوریت کے حامیین یا مخالفین وہ اسکو بہر حال کچھ ترمیم اور تبدیلی کیساتھ ہی اسکو قابل عمل سمجھتے ہیں۔ اس بابت دنیا کے نامور مفکر اور اسکالر سید مودودی نے جمہوریت سے متعلق تقابلی نقطہ پیش کیا ہے جو مندرجہ ذیل ہے۔

اولین سوال یہ ہے کہ انسانی معاملات کو چلانے کے لیے اصولاً کون سا طریقہ صحیح ہے؟ آیا یہ کہ وہ معاملات جن لوگوں سے تعلق رکھتے ہیں ان کی مرضی سے سربراہ کار مقرر کیے جائیں اور وہ ان کے مشورے اور رضامندی سے معاملات چلائیں اور جب تک ان کا اعتماد سربراہ کاروں کو حاصل رہے اسی وقت تک وہ سربراہ کار رہیں؟ یا یہ کہ کوئی شخص یا گروہ خود سربراہ کار بن بیٹھے اور اپنی مرضی سے معاملات چلائے اور اس کے تقرر اور علیحدگی اور کارپردازی میں سے کسی چیز میں بھی ان لوگوں کی مرضی ورائے کا کوئی دخل نہ ہو جن کے معاملات وہ چلا رہا ہو؟ اگر ان میں سے پہلی صورت ہی صحیح اور مبنی بر انصاف ہے تو ہمارے لیے دوسری صورت کی طرف جانے کا راستہ پہلے ہی قدم پر بند ہو جانا چاہیے، اور ساری بحث اس پر ہونی چاہیے کہ پہلی صورت کو عمل میں لانے کا زیادہ بہتر طریقہ کیا ہے؟

دوسری بات جو نگاہ میں رہنی چاہیے وہ یہ ہے کہ جمہوریت کے اصول کو عمل میں لانے کی جو بے شمار شکلیں مختلف زمانوں میں اختیار کی گئی ہیں یا تجویز کی گئی ہیں، ان کی تفصیلات سے قطع نظر کرکے اگر انہیں صرف اس لحاظ سے جانچا اور پرکھا جائے کہ جمہوریت کے اصول اور مقصد کو پورا کرنے میں وہ کہاں تک کامیاب ہوتی ہیں، تو کوتاہی کے بنیادی اسباب صرف تین ہی پائے جاتے ہیں۔

اول: یہ کہ "جمہور" کو مختلف مطلق اور حاکم مطلق (Sovereign) فرض کر لیا گیا اور اس بناء پر جمہوریت کو مطلق العنان بنانے کی کوشش کی گئی۔ حالانکہ جب بجائے خود انسان ہی اس کائنات میں مختار مطلق نہیں ہے تو انسانوں پر مشتمل کوئی جمہور کیسے حاکمیت کا اہل ہو سکتا ہے۔ اسی بناء پر مطلق العنان جمہوریت قائم کرنے کی کوشش آخر کار جس چیز پر ختم ہوتی رہی ہے وہ جمہور پر چند آدمیوں کی عملی حاکمیت ہے۔ اسلام پہلے ہی قدم پر اس کا صحیح علاج کر دیتا ہے۔ وہ جمہوریت کو ایک ایسے بنیادی قانون کا پابند بناتا ہے جو کائنات کے اصل حاکم (Sovereign) نے مقرر کیا ہے۔ اس قانون کی پابندی جمہور اور اس کے سربراہ کاروں کو لازماً کرنی پڑتی ہے اور اس بناء پر وہ مطلق العنانی سرے سے پیدا ہی نہیں ہونے پاتی جو بالآخر جمہوریت کی ناکامی کا اصل سبب بنتی ہے۔

دوم: یہ کہ کوئی جمہوریت اس وقت تک نہیں چل سکتی جب تک عوام میں اس کا بوجھ سہارنے کے لائق شعور اور مناسب اخلاق نہ ہوں۔ اسلام اسی لیے عام مسلمانوں کی فرداً فرداً تعلیم اور اخلاقی تربیت پر زور دیتا ہے۔ اس کا مطالبہ یہ ہے کہ ایک ایک فرد مسلمان میں ایمان اور احساس ذمہ داری اور اسلام کے بنیادی احکام کا اور ان کی پابندی کا ارادہ پیدا ہو۔ یہ چیز جتنی کم ہوگی جمہوریت کی کامیابی کے امکانات کم ہوں گے اور یہ جتنی زیادہ ہوگی امکانات اتنے ہی زیادہ ہوں گے۔

سوم: یہ کہ جمہوریت کی کامیابی کے ساتھ چلنے کا انحصار ایک بیدار مضبوط رائے عام پر ہے اور اس طرح کی رائے عام اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب معاشرہ اچھے افراد پر مشتمل ہو، ان افراد کو صالح بنیادوں پر ایک اجتماعی نظام میں منسلک کیا گیا ہو اور اس اجتماعی نظام میں اتنی طاقت موجود ہو کہ برائی اور برے اس میں نہ پھل پھول سکیں اور نیکی اور نیک لوگ ہی اس میں ابھر سکیں۔ اسلام نے اس کے لیے بھی ہم کو تمام ضروری ہدایات دے دی ہیں۔

اگر مندرجہ بالا تینوں اسباب فراہم ہو جائیں تو جمہوریت پر عملدرآمد کی مشینری خواہ کسی طرح کی بنائی جائے، وہ کامیابی کے ساتھ چل سکتی ہے اور اس مشینری میں کسی جگہ کوئی قباحت محسوس ہو تو اس کی اصلاح کر کے بہتر مشینری بھی بنائی جا سکتی ہے۔ اس کے بعد اصلاح وارتقاء کے لیے صرف اتنی بات کافی ہے کہ جمہوریت کو تجربے کا موقع ملے۔ تجربات سے بتدریج ایک ناقص مشینری بہتر اور کامل تر بنتی چلی جائے گی۔

خلاصہ بحث

اس بحث میں یہ بات کسی قدر واضح ہو جاتی ہے کہ مغرب جس بنیادی حقوق انسانیت کی حفاظت کی بات کرتا ہے تو ہمیں ان گنت مثالیں ایسی بھی مل جاتی ہیں کہ انسانیت کے تقدس کی پامالی کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے، لیکن اسکے ساتھ ساتھ بعض مسلم ممالک میں وضع کردہ نظام میں تو کبھی کبھار ایسا لگتا ہے کہ انسان اشرف المخلوقات کہلانے کا بھی حق دار نہیں۔۔ مغرب میں قانون اور اخلاق عامہ کے تحت مساوات، حیثیت و مواقع قانون کی نظر میں برابر ہوتے ہیں، لیکن بعض مسلم ممالک کا پیمانہ ہی کچھ اور ہے، غریب کے لئے دروازے بند، تو اشرافیہ کے لئے رات کی تاریکی میں بھی زنجیر جہانگیری نظر آتی ہے۔ مغرب میں اقتصادی اور سیاسی عدم خیال، اظہار خیال، عقیدہ، اور ارتباط کی آزادی کے نظارے دیکھنے کو مل جاتے ہیں کہ رشک ہوتا ہے کہا اسلامی نظام زندگی نے بھی انہی مقاصد کے تحت زندگی گزارنے کا سلیقہ سکھایا تھا جس کا نام اسلامی تصور حیات رکھا گیا، لیکن ہر گزرتے دن ہم اس تصور ست دور ہوتے جا رہے ہیں۔۔ مغرب کا جمہوری نظام ہے لیکن اسے اسلامی نظام کے وسیع خیال پر فوقیت نہیں دی جا سکتی۔ کیونکہ اسلامی نظام میں جتنے حقوق اور مراعات انسانوں کو دیے گئے، اس کا تصور سیکڑوں برس

پہلے مغرب نے بھی نہیں کیا تھا۔ اسلامی اور جمہوریہ نظام کو یکجا کر کے یہ گردانا جاتا ہے کہ جمہوریت کا بھی نفاذ ہو گیا اور اسلام کا بھی جو سراسر غلط ہے۔ مغرب کے جمہوری نظام کے فوائد بتانے کے نقاط کا مقصد صرف یہی ہے کہ ہم نے جو، بھی جیسا بھی نظام ان سے لیا، اگر اس کی روح کے مطابق بھی نافذ کر دیا جاتا تو شاید کئی سنگین و حساس معاملات میں دشواریوں کا اتنا سامنا نہ ہوتا، جتنا آج ہمیں عدم برداشت اور قانون کی حکمرانی کے حوالے سے درپیش ہے۔

مذہب و عقائد کے اختلافات کے باوجود سیکولر نظام سیاست کے دعودار ممالک ایسے بھی ہیں جسکو نہ تو جمہوری کہا جا سکتا ہے نہ سیکولرازم، بلکہ وہ فاشسٹ اور انتہا پسندی کی بدترین مثالوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔۔ مسلم اکثریتی ممالک میں اسلام بھی اپنی حقیقی روح کے مطابق نافذ نہیں بلکہ بادشاہت اور موروثیت کے نظام کے تحت قائم ان کی حکومتیں، انسانی حقوق کی فراہمی کی وہ روح پیش نہیں کر پا رہی، جو نظام اسلام کا خاصہ ہے، اسلام، نسل، رنگ اور نسب کے امتیازات کو تسلیم نہیں کرتا، انحطاط کے دور میں بھی اسلامی معاشرہ ان تعصبات سے نمایاں طور پر پاک رہا ہے، جنھوں نے دنیا کے دوسرے حصوں میں انسانوں کے باہم تعلقات کو زہر آلود کر دیا تھا۔

References

[i]Bastian Herre (2021) The ‘Regimes of the World ‘Online Resource-https://ourworldindata.org/regimes-of-the-world-data
[ii]Mufti Muhmad shafi,Islam mai mashwera ki ahmeyat,
[iii]Ainul Haq Sayed -Tahzibin-Page 33-Arsalan Publications-Lahore
[iv]Britanica -Alano Island-Eye-13th Edition-1926 ,V4, p5, The encyclopedia Britanica Company
[v]Aflaton-jamhoria-Mutarajim-Muhmad,Hadi-page-6-Darutaba-jamia Usmania-1353-A.H-Hydrabad Dakan
[vi]Britanica -Alano Island-Eye-13th Edition-1926 ,V4, p5, The encyclopedia Britanica Company
[vii]Mufti Taqi Usmain,Islam or seyasi Nazreyat,pg,27,2009,Maktaba Mariful Quran,Karachi
[viii]J. Alder and others ,Great book, Volume 35,page 17 to 67
[ix]Taqi Usmai,Islam or seyasi Nazreyat, pg,144,2009,Maktaba Mariful Quran,Karachi
[x]Prof-Erik Olin-The End of politicians,pg-123,new York University
[xi]Abdul Rehman kilani,Khilafat o Jmahoreyet,pg 196,Maktaba Salam,2002,Sunpora-Lahore
[xii]Abul Kalam Azad ,Masla khilafat,pg,293,Maktaba jamal,2006,Urdu Bazar-Lahore-
[xiii]Zahid Sidiq Mughal,Jamhoreyat k tnazur mai brpa islami jadujihad ka tanqidi jyza.